# تحریکِ آزادی میں شعرا و ادبا کا کردار

ڈاکٹر گلشن طارق

Dr. Gulshan Tariq

Dean Faculty of Languages

Lahore Garrison University, Lahore.

***Abstract:***

*When nations are going through their hard times, historians perform their duty. Alongwith them many writers and poets also contribute through their creations. British rule was set in Indian sub continent after the decline of Mughal empire. The lives of Indians were made tidium especially the lives of Muslims. At that time, many Muslims personalities come forward to bring Muslims out of this distriss. Alongwith political leaders, many litterateur and poets guoid muslims through thier writings. It was due to these leaders that Independence movement was successful and Muslims were able to craft a sperate homeland Pakistan for themselves.*

ادب اور تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی پچاس کتابوں کا نچوڑ ایک ادبی تخلیق میں مل سکتا ہے۔ جب قومیں اپنے ارتقائی مراحل سے گزر رہی ہوتی ہیں تو مورخ اپنا فرض ادا کرتا ہے اور ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات کے ذریعے زندگی کے روز و شب بیان کرتا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء تک تقریباً ایک ہزار برس حکومت کی۔ مختلف مسلمان ممالک میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں سنسکرت کے علاوہ کئی ایک مقامی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ مسلمان جب ہندوستان کے حکمران بنے تو وہ اپنی زبانیں ساتھ لائے۔ وقت کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے خمیر سے ایک زبان تیار ہوئی جو اردو کہلائی۔ اس میں تینوں مذکورہ بالا زبانوں کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہوئے۔ اس طرح یہ زبان قریباً ہندوستانی مسلمان حکمران اور مقامی لوگوں کو سمجھ آنے لگی۔ فاروق ملک اپنی کتاب تخلیق پاکستان میں لکھتے ہیں:

''برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے سنسکرت، پراکرت اور دیگر

بھاشائیں مختلف علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔ مسلمان آئے تو زبان کے معاملہ میں بڑی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ مقامی پراکرت اور دیگر زبانوں کا ملاپ، فارسی، عربی اور ترکی سے ہوا۔ اور اس تال میل سے ایک نئی مشترکہ زبان برصغیر کے شمالی حصوں میں نمودار ہوئی۔ یہ زبان مقامی آبادی اور برصغیر میں باہر سے آنے والوں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بنی اور بالآخر ایک مشترکہ ورثہ کی صورت میں ڈھل گئی۔ یہ زبان ''اردو'' تھی۔ جسے برصغیر میں موجودہ صدی کے آغاز تک باقی تمام مقامی زبانوں پر برتری حاصل رہی۔''(۱)

اردو زبان میں ادب تخلیق ہونے لگا۔ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے حصہ لیا۔ یوں اردو زبان علمی، تہذیبی، تخلیقی اور عالم گیر زبان بن گئی۔

انگریز کی ہندوستان میں آمد کے بعد ہندوستان کا آرام چین اور سکون تلپٹ ہو گیا۔ انگریز اور دوسری قوموں نے ہندوستان کو لوٹ مار کے لیے چن لیا۔ اس میں سب سے زیادہ انگریز کامیاب ہوئے۔ انگریز اس وقت کے جدید ہتھیاروں سے لیس تھے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کسی اصول و قانون کی پروا نہ کرتے تھے۔ درحقیقت ہندوستان ان کے لیے سونے کی ایک چڑیا تھا۔ فاروق ملک ''تخلیق پاکستان'' میں انگریزوں کے مذموم مقاصد کا تذکرہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

''ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اقتدار کو بڑھانے اور علاقوں کو فتح کرنے کا جو سلسلہ بنگال میں سراج الدولہ اور میسور میں سلطان ٹیپو کو شکست دے کر شروع کیا تھا رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دہلی پر عملاً قابض ہونے کے بعد انگریز کمپنی نے یکے بعد دیگرے کئی علاقوں کو تاراج کیا۔ کمپنی نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے جھوٹ، دھوکے، فریب، سازش اور قتل و غارت کا سہارا لیا۔ مختلف بہانوں سے علاقے ہتھیائے اور جہاں اسے اپنے عزائم کی تکمیل میں مشکل پیش آئی، جنگ و جدل کا سہارا لیا۔''(۲)

پہلے پہل وہ تاجروں کے روپ میں ہندوستان آئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے تجارت شروع کی۔ انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی کالونی بنا لیا۔ مغلیہ حکومت کے آپس کے اختلافات، رنگ رلیوں میں ملوث ہونا اور اندرونی سازشوں کی وجہ سے انگریز ہندوستان پر قابض ہوتے چلے گئے۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک وہ ہندوستان پر مکمل طور پر قابض ہو گئے

اور ہندوستان پر ملکہ وکٹوریہ کی حکومت قائم ہوگئی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ اہل ہند کے لیے بڑا کرب ناک تھا۔ خاص طور پر اہل دہلی کے لیے یہ کڑا وقت تھا۔ ہر طرف قتل و غارت گری، لوٹ مار، قحط سالی اور جاٹوں، روہیلوں اور سکھوں نے لوٹ مار مچادی۔ اس دوران نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی بلائے ناگہانی کی طرح ہندوستان پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ مغلیہ سلطنت کی اس کمزوری کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب انگریزی حکومت قائم ہوگئی اور ہندوستان کی آبادی ان کے عتاب کا شکار ہوگئی۔ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ اس لیے انگریزوں کے غیض وغضب کا نشانہ بھی مسلمان ہی بنے۔ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے سرسید احمد خان اور ان کے ساتھی میدان میں اترے اور انھیں وقت کی نزاکت کا احساس دلانے لگے۔ مسلمان تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے اور سرکاری نوکریوں سے دور تھے جس کے سبب ان کی مالی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ ایس کے موجمدار اپنی کتاب ''جناح اور گاندھی'' میں لکھتے ہیں:

> ''خوش قسمتی سے جہالت کے ان تاریک ایام میں ایک بڑا مسلمان رہنما پیدا ہوا جسے دنیا آج سرسید احمد خان کے نام سے جانتی ہے۔ سرسید نے سب سے پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ سرسید وہ پہلے رہنما تھے جنھوں نے مسلمان نوجوانوں کو انگریزی تعلیم کی جانب راغب کیا۔ ان کی اولین ترجیح یہ تھی کہ حکمران طبقے کے دل میں مسلمانوں کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہو سکے اور سرکار کے ساتھ ان کے تعلقات بہتر ہوسکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ سیاست سے کنارہ کش رہیں اور اپنی پوری توجہ تعلیم پر مرکوز رکھیں۔''(۳)

سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار مسلمانوں کو ہندوستانی معاشرے میں ہر لحاظ سے اعلیٰ مقام دلانے کے لیے کوشاں رہے۔ سرسید کی اس تحریک کو تحریک علی گڑھ کا نام دیا گیا۔ سرسید نے اردو میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس میں ہر طرح کے علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مضامین لکھے جانے لگے۔ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے نفرت تھی۔ انھوں نے اس جہالت کے خلاف قدم اٹھایا۔ اس پر انھیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں کرسٹائن ملحد اور نیچری کے نام سے پکارا گیا۔ مگر ان کا خیال تھا کہ جدید فلسفہ اور سائنس کی تعلیم سے اسلام کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ علی گڑھ

تحریک کے اثرات اردو زبان و ادب پر بہت گہرے مرتب ہوئے۔ یہ وہ عہد تھا جب ادب کا پہلے عام زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ محض تفریحِ طبع کے لیے لکھا جاتا تھا۔ مگر اس تحریک کے زیرِ اثر جو ادب لکھا گیا وہ مقصدیت کے تحت لکھا گیا۔

لاہور میں انجمن پنجاب کے نام سے ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی گئی تاکہ مقصدی ادب کی ترقی و ترویج ہو۔ حالی جو مسلمان قوم کا درد دل میں رکھتے تھے، انھوں نے اس میں خاص دلچسپی کی۔ اس انجمن کے تحت ہونے والے مشاعروں کے باعث اردو شاعری کو ایک نئی جہت ملی۔ رام بابو سکسینہ ''تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارے کے انبار ہیں وہ سب نکال دیئے جائیں۔'' (۴)

انجمن پنجاب کے زیرِ سایہ ہونے والے مشاعروں میں روایتی اور عشقیہ مضامین کو چھوڑ کر با مقصد موضوعات کا انتخاب کیا گیا۔ محمد حسین آزاد جو اس وقت محکمہ تعلیم میں ملازمت کرتے تھے اور حالی کی کوششوں سے جدید اردو شاعری ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئی۔

سرسید احمد خان ایک مخصوص نقطہ نظر کے حامل تھے۔ وہ مسلمانوں اور انگریز کے درمیان مصالحت چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں اور سرکاری ملازمتوں تک رسائی حاصل کر سکیں۔ مشرقی تہذیب کے پرستار منشی سجاد انگریزی تہذیب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اخبار ''اودھ پنچ'' کے ذریعے انگریزی تہذیب کے خلاف لکھنا شروع کیا اور اس اخبار کے ذریعے اردو ادب میں طنز و مزاح کو فروغ دینے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار کے نکلتے ہی ملکی فضا قہقہوں سے لبریز ہوگئی۔ اس سامراجی عہد میں طنز و مزاح کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ''اودھ پنچ'' انیسویں صدی کے وسط میں شائع ہونے والے اخبار ''لنڈن پنچ'' سے ملتا تھا اور اس کا مقصد انگریزی خیالات کی شدت کو کم کرنا تھا۔ اس اخبار نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے لکھنے والوں کا مذاق اڑایا۔ سرسید، سرشار، شرر، داغ، حالی، اقبال، سب کے سب اودھ پنچ کے لکھنے والوں کے طنز کا نشانہ بنے۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ جن کا مذاق اڑایا گیا وہ اپنے کام کی وجہ سے نامور ہوئے۔

اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں اکبر الٰہ آبادی کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کے دماغ سے مغربی غلامی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ایک طرف انگریز سرکار کی طاقت تھی تو دوسری طرف کمزور اور خستہ حال مسلمان تھے۔ اکبر نے تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور حق کی آواز بلند کی۔ اکبر ہر تبدیلی کو مذہب پر حملہ تصور کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے تحریک علی گڑھ کی مخالفت کی۔ انھوں نے سرسید اور انگریزی تہذیب کا مذاق اڑایا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اکبر الٰہ آبادی کے طنز و مزاح پر

روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''سرسید کی عقل پرستی کا ردِعمل اودھ پنچ کے لکھنے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن اس کا حلقہ اس وقت محدود تھا۔ مسلمانوں نے سرسید کی دعوت کو اپنی حالت کا بہترین حل تصور کیا تھا۔ اس لیے اکبر کی شاعری میں بزلہ سنجی سے گزر کر طنزیہ لہجہ زیادہ نکھر کر سامنے آیا۔''(۵)

اس سامراجی عہد میں اقبال کی آواز سب سے زیادہ با اثر ثابت ہوئی۔ ان کی شاعری مسلمان قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے اور اپنی اصل کی پہچان کرانے کے لیے تھی۔ انھوں نے اپنا پیغام ملک و ملت تک شاعری کے ذریعے پہنچایا۔ نثر کا ذخیرہ کچھ زیادہ نہیں مگر قابلِ قدر ہے۔ اقبال جب تعلیم کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے اس وقت لاہور میں ہونے والی ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ یہ محفلیں لاہور میں بازارِ حکیماں میں ہوتی تھیں۔ اس دور کے نامور شعرا اس میں شرکت کرتے تھے۔

لاہور کے چند ایک مسلمان جن کے دل میں قومی درد تھا انھوں نے ان حالات کا جائزہ لیا جو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو گھیرے ہوئے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماج کی سرگرمیوں نے مسلمانوں کے لیے کیا کیا مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔ تب انھوں نے ایک ایسی انجمن بنانے کا سوچا جو مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی، تعلیمی اور معاشرتی حالات کو سدھارنے میں معاون ہو۔ اس ضمن میں ۱۸۸۴ء میں ''انجمن حمایت اسلام'' کی بنیاد رکھی گئی۔ انجمن حمایت اسلام کے تحت جلسے ہونے لگے۔ بظاہر یہ جلسے چندا اکٹھا کرنے کی ایک مہم تھے لیکن ان کی ادبی حیثیت بھی تھی۔ ان جلسوں سے شعر و ادب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اقبال بھی انجمن حمایت اسلام کے مستقل ممبر بن گئے۔ اس کے سالانہ جلسے میں پہلی مرتبہ انھوں نے اپنی نظم ''نالہ یتیم'' پڑھی۔ ان کے نظم پڑھنے پر سامعین کے جو جذبات و تاثرات تھے اس سلسلے میں ملک حسن اختر ''اطراف اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''شیخ محمد اقبال صاحب نے ''نالہ یتیم'' جو چھپا ہوا تھا پڑھنا شروع کیا، اس کے ہر شعر پر تحسین و آفریں کے نعرے چاروں طرف بلند ہو رہے تھے اور سینکڑوں آنکھیں اشک بہا رہی تھیں۔''(۶)

اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو انھیں مغربی تہذیب کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ وہ جدید عہد کے سائنسی اور علمی تقاضوں کو بھی سمجھنے لگے جس کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں کیا۔ اقبال نے مسلمان قوم میں خود شناسی اور خود آگاہی کے احساس کو بیدار کر کے بہت جلد مسلمانوں میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل کر لی۔ ڈاکٹر انور سدید ''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کو سابقہ ادبی تحریکوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ ان کے زمانے میں فلسفہ اور سائنس ترقی کے انتہائی مدارج طے کر رہے

تھے۔ اکناف عالم کی حدود سمٹ کر ایک نقطے میں سما رہی تھیں۔ رسل ورسائل اور ذرائع نقل وحرکت کی متعدد ایجادات نے دنیا بھر کے انسانوں کا آپس میں میل جول نہایت آسان بنا دیا تھا۔ چنانچہ اقبال کو نہ صرف جدید علوم سے استفادہ کا موقع ملا بلکہ عربی، فارسی، انگریزی اور جرمنی کے فکری ماخذات تک براہ راست رسائی حاصل ہوئی۔''(۷)

شیخ عبدالقادر نے ''مخزن'' کا اجرا ۱۹۰۱ء میں کیا۔ انھوں نے یہ رسالہ محض ادب کو فروغ دینے کے لیے جاری نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعے برصغیر کے اجتماعی مزاج کو بدلنے کی کوشش کی۔ ''مخزن'' نے زندگی کے ارتقا کو ادب سے براہ راست منسلک کیا۔ ''مخزن'' نے اقبال کو متعارف کرایا۔ ان کی پہلی نظم ''ہمالہ'' مخزن ہی میں شائع ہوئی۔ اقبال کے علاوہ اس عہد کے دیگر شعرا و ادبا جن میں سے کچھ رومانوی طرزِ فکر کے حامل تھے اور کچھ ترقی پسندانہ سوچ رکھتے تھے وہ بھی مخزن کے ادبی منظر نامے پر نظر آنے لگے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''اس عہد کے بیشتر نوجوان ادبا مخزن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس دور میں جو ادبا مخزن کے صفحات سے نمایاں ہوئے ان میں اقبال، ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، آغا قزلباش، ظفر علی خاں، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ، مہدی آفادی، لطف الدین احمد، خواجہ حسن نظامی اور شیخ عبدالقادر کے اسماء بے حد اہم ہیں۔''(۸)

ابوالکلام آزاد نے دقیق نثر لکھی۔ وہ اعلیٰ پائے کے انشا پرداز تھے۔ وہ رومانوی انداز میں لکھتے تھے اور تشبیہوں اور استعاروں سے معنی کا ایک جہان پیدا کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے:

''ابوالکلام تاریخی حوالوں، تشبیہوں اور استعاروں سے بار بار ماضی کی طرف لوٹتے ہیں اور ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس سے مجموعی طور پر ایک طلسم زار مرتب ہو جاتا ہے۔''(۹)

انھوں نے ۱۹۱۲ء میں رسالہ ''الہلال'' جاری کیا۔ اس کی اشاعت سے ایک طرف علماء میں سیاسی مسائل کا احساس پیدا ہوا اور دوسری طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے دل میں اسلام کی محبت اور عظمت پیدا کی۔

خواجہ حسن نظامی کو خاکہ نگاری، انشا پردازی اور مزاح نگاری میں کمال حاصل تھا۔ وہ بذلہ سنج تھے، ان کی زبان ٹکسالی اور لطیف تھی۔ وہ الفاظ کو افسانوی رنگ میں ڈھالنے کا سلیقہ خوب جانتے تھے۔ سید احتشام حسین ''داستان اردو'' میں رقم طراز ہیں:

''خواجہ حسن نظامی نے تاریخی کہانیاں اور مضامین ایسے دلکش طریقے سے لکھے کہ افسانہ حقیقت بن گیا، درحقیقت افسانہ معلوم ہونے لگی۔ خاص کر غدر دہلی کے بارے میں ان کی کتابیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔''(۱۰)

اس زمانے میں بنگال کی تقسیم کی وجہ سے کافی ہنگامہ برپا تھا۔ پریم چند نے ان واقعات سے متاثر ہوکر ''سوز وطن'' کے افسانے لکھے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کی عظمت بیان کی۔ پریم چند ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے حالات سے متاثر ہوکر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس زمانے میں آزادی کی جدوجہد تیز ہوچکی تھی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۲ء تک پریم چند نے زیادہ تر سیاسی افسانے لکھے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء کے درمیان وہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے متاثر ہوئے اور اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۱۹۳۶ء میں اس تحریک کے ہونے والے اجلاس کی بھی انھوں نے صدارت کی۔

پریم چند اصلاحی پہلو کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے۔ وہ مقصدی ادب کے قائل تھے۔ معاشرے کے فرسودہ رسم ورواج کے خلاف اپنے قلم کے ذریعے لڑتے۔ سید احتشام حسین ''داستان اردو'' میں پریم چند کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انھوں نے زندگی کی سچی تصویر کھینچنے اور عام لوگوں کے بارے میں لکھنے اور دیہاتی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور الجھنوں کی مرقع کشی کرنے اور انسانوں کو ان کی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ دیکھنے کی طرف توجہ کی۔''(۱۱)

شوکت علی تھانوی مزاح کے پردے میں لوگوں کو ہنسانے میں کامیاب رہتے۔ انھوں نے چند ایک مضامین ہی لکھے تو مشہور ہو گئے۔ انھوں نے اکبر الٰہ آبادی کی طرح اپنے دل کی آنکھ سے اپنے عہد کے سماج کو دیکھا اور جدوجہد آزادی میں اپنا حصہ ڈالا اور ''سودیشی ریل''، ''تعزیت'' اور ''لکھنو کا کانگریس سیغن'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔ محمد عبداللہ قریشی ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' شوکت تھانوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۳۰ء میں رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور کے سالنامے میں ایک مزاحیہ مضمون ''سودیشی ریل'' لکھا جو اتنا مقبول ہوا کہ سارے ہندوستان میں شوکت تھانوی کی مزاح نگاری کی دھوم مچ گئی''۔(۱۲)

ہندوستان کے مسلمانوں کی جو حالت تھی اس پر شوکت تھانوی پریشان ہوتے۔ وہ مسلمانوں کے شاندار ماضی پر غور کرتے تو ان کی تکلیف میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ محمد عبداللہ قریشی ''معاصرین

اقبال کی نظر میں'' شوکت تھانوی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''شوکت مسلمانوں کے حال پر کڑھتے، ان کے عروج و زوال کی تاریخ پر نظر ڈال کر طبائع کو غور و فکر کو دعوت دیتے اور حقیقی نفع و نقصان سمجھنے پر آمادہ کرتے۔ وہ کہتے ہیں روحانیت چھوڑ کر مادیت کی طرف بڑھنا آزادی نہیں۔''(۱۳)

غلام بھیک نیرنگ کی نظموں کے موضوعات قومی تھے۔ انھوں نے زندگی کے مسائل پر قلم اٹھایا۔ ان کی زیادہ تر نظمیں اصلاحی اور قومی درد سے لبریز ہوتیں۔ چکسبت برج نرائن نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ افراتفری کا زمانہ تھا۔ چکسبت کے ہاں حب وطن اور قوم سے محبت کا جو جذبہ شدت سے موجزن ہے وہ اردو شعرا میں کسی اور کے ہاں نہیں ملتا۔ ان کے مجموعہ کلام ''صبح وطن'' میں قومی واقعات پر لکھی گئی نظمیں ہیں۔ حسرت موہانی نے شاعری میں سیاسی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی کی۔ ان کی شاعری میں ایسے اشعار جا بجا نظر آتے ہیں جن میں ان کے عہد کے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

مولانا ظفر علی خان نے ۱۹۰۹ء میں ''زمیندار'' اخبار کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ زمیندار اخبار مسلمان قوم کا نجات دہندہ بن گیا۔ اس کے اداریوں اور سیاسی نظموں نے دھوم مچادی۔ وہ شعلہ بیان مقرر تھے۔ ان کے جتنے بھی مجموعہ کلام ہیں ان میں سیاسی بیداری کے لئے لکھی گئی نظمیں شامل ہیں۔ انھوں نے ان نظموں کے ذریعے مسلمانوں کی حمیت کو بیدار کیا۔ قائداعظم کی مدح سرائی مولانا ظفر علی اپنی نظم ''محمد علی جناح کا فلسفہ'' میں اس طرح سے کرتے ہیں:

مسلمان پہلے دن سے ہیں بتوں کو توڑنے والے
سنا دو یہ پرانا قصہ گاندھی جی کے چیلوں کو
سہل ہو، لات ہو، شو جی ہو سب مر کر ہوئے مٹی
بچھڑتا دیکھتی آئی ہے دنیا ان سب کے میلوں کو
مگر کعبہ کا وہ اللہ قائم اور دائم ہے(۱۴)

اس نظم کا موضوع مسلمانوں اور بت پرستوں کا فرق بتایا ہے۔ مسلمان کا نظریہ توحید ہے مگر ہندو نہ جانے کتنے بتوں کو اپنے ہاتھوں سے بنا کر پھر ان کی ہی پوجا کرتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ باتیں گاندھی اور ان کے حواریوں کو بتانے والی ہیں۔

جن ادبا اور شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ اس عہد میں اور بہت سارے شاعر اور ادیب، ادب لکھ رہے تھے مگر یہاں خاص طور پر ان کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں اپنا حصہ ڈالا۔ قائداعظم تو چاہتے تھے کہ مسلمان اور ہندو مل جل کر اس خطے میں رہیں مگر ہندوؤں کے رہنما الٹی چالوں سے باز نہ آتے تھے۔ آئے دن ہندو مسلم فسادات ہوتے تھے۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو اقبال نے قائد

اعظم کے نام ایک خط لکھا:

''چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ صرف شمال مغربی ہندوستان میں گزشتہ تین ماہ میں کم از کم تین (فرقہ وارانہ) فسادات ہو چکے ہیں۔''(۱۵)

ہندو اردو زبان کو ملیا میٹ کر دینا چاہتے تھے مگر قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے جس وجہ سے انھوں نے کانگرس جوائن کی تھی مگر گاندھی اور ہندوؤں کا رویہ بڑا معاندانہ تھا۔اس ضمن میں لارڈ دیول نے انگریزوں کا موقف بیان کرتے ہوئے کہا:

''ہم آپ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بھرپور کوشش کرتے رہے ہیں... فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے کی ذمہ داری کانگریس پر عائد ہوتی ہے جس کی وزارتوں نے ۳۹۔۱۹۳۷ء کے دوران اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کبھی مساوی سلوک نہیں کرے گی اور پھر اس کے نتیجے میں مسلم لیگ ابھری اور تصورِ پاکستان ابھر کر سامنے آیا۔''(۱۶)

گاندھی کبھی اپنی بات پر قائم نہ رہتا۔اس کا رویہ ہمیشہ مسلمان مخالف رہا،اس ضمن میں ایس کے موجمدار لکھتے ہیں:

''آسمانی فضاؤں میں پرواز کرنے اور مسیحا کا کردار ادا کرنے کی شدید خواہش میں گاندھی جی نے ہندوستان کے ارضی مفادات کو یکسر فراموش کر دیا۔ انھوں نے راستے کے سرخ نشان بھی نہیں دیکھے۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک نے جلتی پر تیل کا کردار ادا کیا اور ایک الگ اور خودمختار مسلم ریاست کے قیام کے لئے مسلم لیگ کے راستے کی تمام رکاوٹیں جلا دیں۔''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک نے قیام پاکستان راستہ ہموار کیا۔''(۱۷)

تحریک آزادی کی آبیاری میں اس عہد کے ادیبوں اور شاعروں نے بھرپور حصہ لیا اور بالآخر مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ مملکت کے راستے ہموار ہوتے گئے اور اقبال کے خواب کی تعبیر 1947ء میں سامنے آ گئی۔مسلمانوں کو ان کی منزل مل گئی جہاں پر وہ آرام اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے تھے۔

## حوالہ جات


۱۔ فاروق ملک، تخلیق پاکستان، لاہور: خرم بکس، ۱۵۔۲۰۱۴ء، ص: ۱۱۷

۲۔ ایضاً، ص: ۲۳

۳۔ ایس کے موجمدار، جناح اور گاندھی، مترجم: ثوبیہ طاہر، لاہور: سارنگ پبلی کیشنز، س ن، ص:۴۹

۴۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص:۳۶۸

۵۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو نثر کے میلانات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء، ص:۷۷

۶۔ حسن اختر ملک، اطراف اقبال، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۲ء، ص:۴۱

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اقبال کے کلاسیکی نقوش، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۸ء، ص:۵۳

۸۔ ایضاً، ص:۴۹۱

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (مقالہ)، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء، ص:۴۹۵

۱۰۔ احتشام حسین، سید، داستان اردو، کراچی: الکتاب، ۱۹۶۵ء، ص:۹۸

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۰۴۔۱۰۳

۱۲۔ محمد عبداللہ قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص:۵۱۴

۱۳۔ ایضاً، ص:۵۱۶

۱۴۔ ظفر علی خاں، مولانا، دیوان ظفر علی خاں، لاہور: فیضان اکیڈمی، ۲۰۰۵ء، ص:۸۹

۱۵۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، اقبال کے خطوط قائداعظم کے نام، مترجم: جہانگیر عالم، لائل پور: محبوب بکڈپو، ۱۹۷۷ء، ص:۶۵

۱۶۔ زاہد چودھری، پاکستان کیسے بنا، جلد اول، تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی، لاہور: ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۸۹ء، ص:۱۸۔۲۱۷

۱۷۔ ایس۔ کے موجمدار، جناح اور گاندھی، مترجم: ثوبیہ طاہر، ص:۲۶۲


☆.....☆.....☆